قرآن حکیم

قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد

بدءِ اسلام میں اسلام کی دو عظیم ترین حقیقتیں:

قرآن حکیم اور جہاد فی سبیل اللہ

قرآن منبع و سرچشمۂ ایمان و یقین

اور جہاد ایمانِ حقیقی کا مظہرِ اتم

(ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ"، ماہنامہ "میثاق"، لاہور بابت دسمبر ۷۵ء)

واقعہ یہ ہے کہ 'بدءِ الاسلام' میں دین کی اصل اساسی اور بنیادی حقیقتیں دو ہی تھیں ـــــ ایک قرآنِ حکیم جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدّوجہد کے ضمن میں 'آلۂ انقلاب' کی حیثیت حاصل ہے بقول مولانا حالی ؎

اُتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جو جامع عنوان ہے آپؐ کی اس جدّ و جُہد کے مختلف مدارج و مراحل کا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن مجید ہی کی گرج اور کڑک تھی جس نے نیند کے ماتوں کو جگایا اور خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے والوں کو بیدار کیا۔ چنانچہ "وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝" اور "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝" کی چونکا دینے والی صدائیں اور "اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝" اور "اَلْحَآقَّةُ ۝ مَا الْحَآقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝" کی بیدار کن ندائیں ہی تھیں جنہوں نے پورے عرب میں ہلچل مچادی اور "عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝ الَّذِیْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝" کی کیفیت پیدا کردی۔ بقول مولانا حالیؔ ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؑ　　عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی

پھر ——— اسی کی آیات بیّنات تھیں جنہوں نے هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۝ (الحدید:۹) کے مصداق انسانوں کو شرک، الحاد، مادہ پرستی، حُبِّ عاجلہ، اور حیوانیتِ محضہ کے "ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" ایسے مہیب اور ہولناک اندھیروں سے نکال کر ایمان اور یقین کی روشنی سے بہرہ ور فرمایا۔ چنانچہ وہ ایک طرف عرفانِ الٰہی اور محبتِ خداوندی سے سرشار یعنی مستِ بادۂ الست ہوگئے اور دوسری طرف دنیا و مافیہا ان کی نگاہوں میں مچھر کے پَر سے بھی حقیر تر ہوگئے اور وہ کُلّیۃً طالبِ عقبیٰ بن گئے۔

مزید برآں ——— وہی تھا جو "مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ" بھی بن کر آیا، اور "شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ" بھی [illegible] کے ذریعے لوگوں کا تزکیۂ نفس بھی ہوا اور تصفیۂ قلب و تجلیۂ روح بھی!

گویا انذار ہو یا تبشیر [illegible] تعلیم ہو یا تربیت تزکیہ ہو یا تصفیہ، تجلیہ ہو یا تنویر ——— [illegible] محمد رسول اللہ

صلّی اللہ علیہ وسلّم کا پُورا عمل دعوت و اصلاح قرآن مجید ہی کے گرد گھومتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایک نہ دو پورے چار مقامات پر آنحضورؐ کے منہجِ انقلاب کو جن اساسی اصطلاحات کے ذریعے واضح کیا گیا ہے اُن کا اوّل و آخر خود قرآن مجید ہی ہے بفحوائے الفاظِ قرآنی :

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ — سناتا ہے انہیں اُس کی آیات اور پاک
يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ — کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے انہیں
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ:۲) — کتاب اور حکمت !

قرآن کا کارنامہ، ایک جملے میں بیان کیجیے، تو یہ ہے کہ اس نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے دلوں میں ایمان پیدا کر دیا اور توحید، معاد اور رسالت پر یقینِ محکم کی کیفیت پیدا کر دی۔ لیکن اِس سے اُس ہمہ گیر تبدیلی کا اندازہ نہیں ہوتا جو قرآن حکیم کے بدولت اُن کی زندگیوں میں برپا ہو گئی تھی اس لیے کہ قرآن نے اُنؓ کا فکر بدلا، سوچ بدلی، نقطۂ نظر بدلا، اقدار بدلیں، عزائم بدلے، اُمنگیں بدلیں، شوق بدلے، دلچسپیاں بدلیں، خوف بدلے، اُمّیدیں بدلیں، اخلاق بدلے، کردار بدلے، خلوت بدلی، جلوت بدلی، انفرادیت بدلی، اجتماعیت بدلی، دن بدلا، رات بدلی حتّٰی کہ "تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ" کے مصداق آسمان بدلا، زمین بدلی، الغرض پُوری کائنات بدل کر رکھ دی —— اور اِس پوری تبدیلی کا ذریعہ اور آلہ ہیں قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات ! بقول علّامہ اقبالؒ :

بندۂ مومن زِ آیاتِ خداست — ایں جہاں اندر برِ او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانِ دیگرش !

تبدیلی اگر حقیقی اور واقعی ہو تو اُس کی کوکھ سے لازماً تصادم اور کشمکش جنم لیتے ہیں جن کے مراحل تبدیلی کی نوعیّت اور مقدار کی نسبت سے کم و بیش ہو سکتے ہیں۔ ایمان نے جو تبدیلی صحابۂ کرامؓ میں پیدا کی اُس نے جس تصادم اور کشمکش کو جنم دیا اُس کے جملہ مدارج و مراحل کا جامع عنوان ہے "جہاد فی سبیل اللہ"۔

اِس تصادُم اور کشمکش کا اوّلین ظہور انسانوں کی اپنی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ 'مجاہدہ مع النفس' کو 'افضل الجہاد' قرار دیا گیا ہے[1]۔ پھر جب ایمان اشخاص کے باطن میں اس طرح راسخ اور مستولی ہو گیا کہ ریب اور تشکک کے کانٹے نکل گئے تو اب اُسی جہاد و مجاہدہ کا ظہور عالمِ خارجی میں ظالموں سرکشوں اور خُدا کے باغیوں سے کشمکش اور تصادُم کی صورت میں ہوا جس کا مقصد قرار پایا 'تکبیرِ ربّ[2]'، یعنی اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اقرار و اعلان اور اس کی حاکمیّتِ مطلقہ کا بالفعل قیام و نفاذ تاکہ "اُس کی مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو[3]!" —— اور اِس کی آخری منزل ہے "قتال فی سبیل اللہ"، جس کا منتہائے مقصود مُعیّن ہوا اِن الفاظ میں کہ :

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ	اور جنگ کرتے رہو اُن سے یہاں تک کہ
فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ	"فتنہ" بالکل فرو ہو جائے اور اطاعت
كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (الانفال : ۳۹)	کُلّیتہً اللہ ہی کی ہونے لگے !

ایمان و یقین اور جہاد و قتال کا یہی وہ لزوم باہمی ہے جس کو نہایت واضح اور واشگاف الفاظ میں بیان کیا گیا قرآنِ حکیم کی اس آیۂ مبارکہ میں :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	مومن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا	اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر پھر شک میں
وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ	نہ پڑے اور جہاد کرتے رہے اللہ کی راہ
اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ	میں اور کھپاتے رہے اس میں اپنے اموال

---

1. آنحضورؐ سے دریافت کیا گیا : "اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ؟" تو آپؐ نے ارشاد فرمایا : "اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ !"

2. الفاظِ قرآنی کی رُو سے "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝" (المدّثر : ۳) اور بقول علامہ اقبالؒ

یا وُسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدامست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات!

3. سیدنا مسیح علیہ السّلام کے الفاظ۔

هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ٥ (الحجرات: ۱۵) اور اپنی جانیں ۔حقیقت میں یہی ہیں سچے!

واضح رہے کہ اِس آیۂ مُبارکہ کے اوّل و آخر حصر کا اسلوب بھی ہے اور آیۂ ماقبل میں 'حقیقی ایمان' اور 'قانونی اسلام' کے مابین فرق و امتیاز کا مضمون بھی۔ گویا مومنِ صادق کی جامع و مانع تعریف قرآن حکیم کی کسی ایک آیت میں مطلوب ہو تو وہ یہی آیت ہے۔

الغرض قرآن کے اصل حاصل ہیں ایمان اور یقین اور اُن کا لازمی نتیجہ ہیں' جہاد اور قتال۔ اِن میں سے ایمان و یقین اصلاً ایک معنوی حقیقت اور داخلی کیفیت کا نام ہیں، چنانچہ عالمِ خارجی میں اسلام کی دو عظیم ترین اور نمایاں ترین' حقیقتیں ہیں قرآن اور جہاد۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ایمانِ حقیقی کی مستقل علامتوں (SYMBOLS) کی حیثیت رکھتے ہیں اور مردِ مومن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ تخیّل اور تصوّر میں اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لازمی و لابدی ہیں!

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ اور خلافتِ راشدہ کے دوران اسلام کی 'نشأۃِ اُولیٰ' یا غلبۂ دینِ حق کا دَور اوّل بلاشائبۂ ریب وشک نتیجہ تھا صحابۂ کرامؓ کے تعلّقِ قرآن اور جذبۂ جہاد کا ـــــ لیکن یہ بھی ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ جیسے ہی اسلام نے ایک مملکت اور سلطنت کی صورت اختیار کی اِن دونوں کی حیثیت ثانوی ہوکر رہ گئی۔ اور ایسا ہونا ایک حد تک منطقی اور فطری بھی تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو کسی مملکت یا سلطنت میں اوّلین و اہم ترین مسئلہ شہریّت کا ہوتا ہے جو ایک خالص قانونی مسئلہ ہے جس میں تمام تر بحث انسان کے 'ظاہر' سے ہوتی ہے، باطن سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا گویا بقول علّامہ اقبال ؏ " بندوں کو گِنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا!" ـــــ مزید برآں اس کا اصل موضوع نظم ونسق اور امن و امان کا ہوتا ہے جس کے اعتبار سے بنیادی اہمیت قانون اور ضابطے کو حاصل ہوتی ہے نہ مکارمِ اخلاق یا مواعظِ حسنہ کو۔ حتّٰی کہ اس

عتبار سے قصاص عو پر مقدم ہو جاتا ہے ـــــ اور دوسری طرف سلطنتوں اور مملکتوں کو، خواہ وہ اصولی اور نظریاتی ہی ہوں اصل سروکار اپنی حفاظت و مدافعت سے ہوتا ہے، اصولوں اور نظریات کی تبلیغ و اشاعت ہوتی بھی ہے تو ثانوی درجے میں اور حکومتوں کی مصلحتوں کے تابع رہ کر!

یہی وجہ ہے کہ جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دور میں داخل ہوا تو اصل زور (EMPHASIS) ایمان کے بجائے اسلام پر، یقین کے بجائے قرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہو گیا۔ نتیجتاً قرآنِ حکیم کے بھی منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین ہونے کی حیثیت مؤثر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور ذریعۂ قانون اور یکے از ادلّۂ اربعہ[۱] ہونے کی حیثیت مقدم اور مرکزِ توجہ بنتی چلی گئی۔ اور پھر جیسے جیسے مملکت اور سلطنت کے تقاضے پھیلتے گئے اور قانون کی عملداری وسیع ہوتی گئی قرآنِ مجید تو 'چار میں کے ایک' کی حیثیت میں پس منظر میں دھکیل[۲] ہوتا چلا گیا اور توجہات حدیث اور فقہ پر مرتکز ہو کر رہ گئیں[۳]۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علم اور حکمت کے میدان میں جو خلا اس طرح پیدا ہوا اُسے پُر کرنے کے لیے مصر و یونان کی جانب سے فلسفہ و منطق کی آندھیاں آئیں نتیجتاً پورا عالمِ اسلام ارسطو کی منطق اور نو افلاطونی تصوّف کی آماجگاہ بن کر رہ گیا یہاں تک کہ فلسفہ و اصولِ اخلاق کے لیے بھی مسلمانوں کو اغیار کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا[۴]! اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ قرآن نہ منبعِ ایمان رہا نہ سرچشمۂ یقین اور نہ مخزنِ اخلاق رہا نہ معدنِ حکمت ـــــ بلکہ صرف

---

[۱] اصولِ شریعت چار ہیں۔ قرآن، سُنّتِ رسولؐ، قیاس، اجماع انہیں ادلّۂ اربعہ کہا جاتا ہے

[۲] حضرت اکبرؔ کا بہت پیارا شعر ہے

صوم ہے ایمان سے، ایمان غائب صوم گم | قوم ہے قرآن سے، قرآن رخصت قوم گم

(حواشی ۳ و ۴ اگلے صفحے پر دیکھیں)

ایک ایسی "کتابِ مقدس" بن کر رہ گیا جس کے الفاظ یا تو حصولِ برکت اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے کام آسکتے ہیں سلہ۔ اور اس طرح آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ:

لَا يَبْقَىٰ مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا	اسلام میں سے سوائے اُس کے نام کے اور
اِسْمُهُ وَلَا يَبْقَىٰ مِنَ الْقُرْآنِ	کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے سوائے
إِلَّا رَسْمُهُ (مشکوٰۃ: کتاب العلم)	صورتِ الفاظ کے اور کچھ نہ بچے گا۔

بعینہٖ یہی معاملہ 'جہاد' کے ساتھ بھی ہوا، جب اصل زور ایمان پر نہ رہا بلکہ اسلام پر ہوگیا تو جہاد بھی جو ایمانِ حقیقی کا رُکنِ رکین تھا خود بخود نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ اور ساری توجہ ارکانِ اسلام پر مرتکز ہوگئی جن کی فہرست میں جہاد سرے سے شامل ہی نہیں ہے، گویا جہاد پر ظلم قرآن سے بھی بڑھ کر ہوا۔ اس لیے کہ قرآن تو خواہ 'چار میں کے ایک' کی حیثیت ہی سے سہی بہرحال شریعت کے اُصولِ اربعہ میں شامل تو ہے، جہاد تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں شامل نہیں بلکہ نظامِ فقہ میں بھی اس کی حیثیت فرضِ عین کی نہیں صرف فرضِ کفایہ کی ہے۔ اس پر مُستزاد یہ کہ جہاد کا تصوّر بھی مسخ ہوگیا اور اس شجرۂ طیّبہ کی شاخوں کو جڑ اور تنے سے جدا کر کے ہر ایک کو مختلف رنگ دے دیا گیا چنانچہ ایک طرف جہاد مع النفس کا رُخ اعمال اور معاملات کی منجدھار سے پرے ہی پرے اذکار و اوراد اور نفسیاتی

سکہ چنانچہ اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ پر تو بے شمار تصانیف ملتی ہیں لیکن اصولِ تفسیر کے موضوع پر چودہ سو سال میں کل دو رسالے ملتے ہیں ایک امام ابنِ تیمیہؒ کا رسالہ 'اُصولِ تفسیر' اور دوسرا امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا رسالہ 'الفوز الکبیر'

سکہ اسی کا مرثیہ کہا مولانا رومؒ نے اِن الفاظ میں ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں حکمتِ قرآنیہ را ہم بخواں

سلہ ایک تیسرا مصرف قرآن کا وہ ہے جو علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں بیان کیا: ؎

بآیاتش تُرا کارے جُز این نیست کہ از یاسینِ اُو آساں بمیری

ریاضتوں اور ورزشوں کی راہِ یسیر (SHORT-CUT) کے جانب موڑ دیا گیا اور دوسری طرف جہاد کو قتال کے ہم معنیٰ قرار دے کر اس کا مقصد مملکت کی سرحدوں کے تحفظ و دفاع اور بس چلے تو توسیع کے سوا کچھ نہ رہا۔ رہا شرک و ظلم، کفر و فسق اور زور و منکر کی ہر صورت کے ساتھ مسلسل کشمکش اور تصادم اور حق و صداقت کے پرچار، نیکی اور راستبازی کی ترویج، کلمۂ توحید کی نشر و اشاعت اور دینِ حق کے غلبہ و اقامت کے لیے پیہم جدّ و جُہد اور اس کے لیے سمع و طاعت کے اُصول پر مبنی نظامِ جماعت کے قیام کا معاملہ ـــــ گویا فی الجملہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی منظم سعی جو ہر مومن کے لیے فرضِ عین کا درجہ رکھتی ہے تو وہ یا تو سرے سے خارج از بحث ہو گئی یا زیادہ سے زیادہ ایک اضافی نیکی قرار پا کر رہ گئی اور اس سے بالا ہی بالا اور ورے ہی ورے اسلام و ایمان اور تقویٰ و احسان کے جملہ مراحل طے پانے لگے!

اللہ! اللہ کوئی فرق سا فرق ہے اور تفاوت سا تفاوت ابع "ببیں تفاوتِ رہ از کُجا ست تا بہ کُجا!" کے مصداق کُجا وہ کیفیت کہ صحابہ کرامؓ جذبۂ جہاد سے سرشار، بیک زبان، رجزیہ انداز میں یہ شعر پڑھ رہے ہیں:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا
عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا[1]

کُجا یہ حال کہ چودھویں صدی ہجری کے ایک مُتنبّی اور اُس کی ذُرّیتِ صلبی و معنوی نے تو جہاد بالسّیف کو باقاعدہ منسوخ ہی قرار دے دیا۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا حال بھی عملاً کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ع

"کہ رہوارِ لیتین ما بصحرائے گماں گم شد!"

(جاری ہے)

---

[1] (ترجمہ) ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے زندگی کے آخری سانس تک جہاد جاری رکھنے کی شرط پر محمدؐ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے!